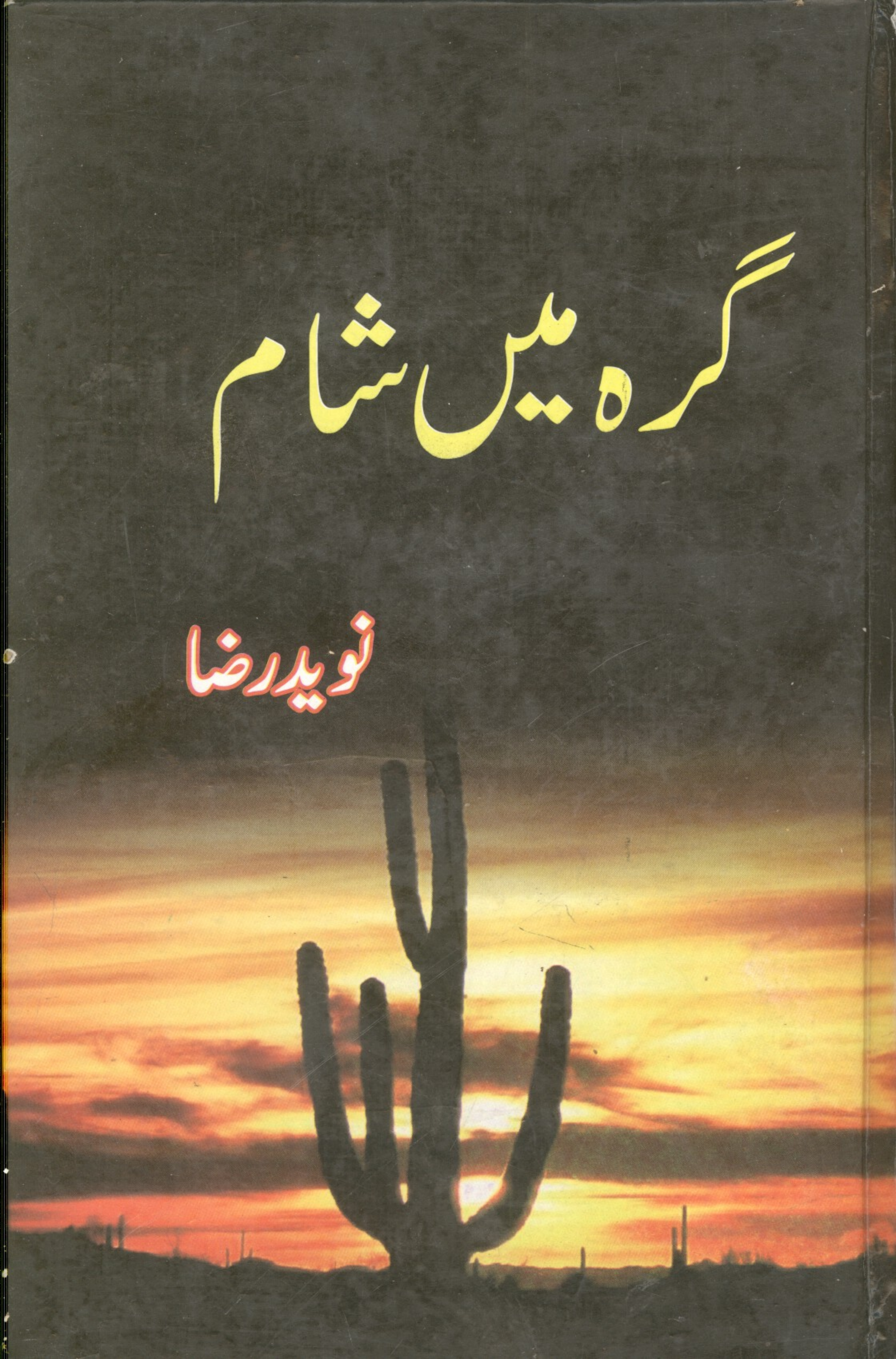

گرہ میں شام
نوید رضا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گرہ میں شام

گرہ میں شام

نوید رضا

فاتح پبلشرز A-8 یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ،
اردو بازار، لاہور فون:7321118

نام کتاب	....	گرہ میں شام (شاعری)
شاعر	....	نوید رضا
ناشر	....	فاتح پبلشرز' لاہور
مطبع	....	رحمانیہ پرنٹرز' لاہور
سنِ اشاعت	....	2001ء
کمپوزنگ	....	اقبال اعتبار
سرورق	....	وقاص انور
قیمت	....	-/100 روپے

ملنے کا پتہ

فاتح پبلشرز

یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار' لاہور فون: 7321118

علم وعرفان پبلشرز

C-7 ماتھر سٹریٹ 9- لوئر مال' عقب میاں مارکیٹ

اردو بازار' لاہور فون: 7352332

انتساب!

تارے

اور

شازی

کے نام

چند ایک صبحیں اب بھی مری دسترس میں ہیں
تیری گرہ میں اب بھی کوئی شام ہے تو لا

ترتیب

01	حرفِ سادہ اور اعجاز کا رنگ	۱۱
02	راہ چلتے ہوئے وہ یونہی دوبارہ مل جائے	۲۱
03	جدا ہوئے تو جدائی میں یہ کمال بھی تھا	۲۳
04	اکیلے ہم ہی نہیں اس بلا کا رزق ہوئے	۲۵
05	مسلسل اجتناب کر رہا ہے وہ	۲۷
06	میں پہلے تو کوئی تصویر کاغذ پر بناتا ہوں	۲۹
07	نوید ہو اے چشم آشنائے خواب	۳۱
08	تم اب بھی خوبصورت ہو (نظم)	۳۳
09	میں کیوں اداس ہوں یاروں سے پوچھتا رہا میں	۳۵
010	شکست مان لوں یہ کام بھی نہیں ہوتا	۳۷
011	نام رخصت ہوا نسب رخصت	۳۹
012	بہتا دریا ہو یا سراب عذاب	۴۱
013	ترے دل کا ارادہ جانتا ہوں	۴۲
014	جو داستاں ہے ابھی داستاں سے باہر ہے	۴۳
015	کچھ اس طرح سلا دیا گیا مجھے	۴۵
016	اُس کی گلی کا در ہے کوئی بام ہے تولا	۴۷
017	کوئی رنج کوئی ملال ہو تو کمال ہو	۴۹
018	یہ راستہ بھی چلو اختیار کر دیکھیں	۵۰
019	یہی کہانی ہے اب تک یہی فسانۂ شام	۵۱

O20	ذرا سا اور بھی رنجور ہونا چاہتا ہوں	۵۳
O21	دھند میں لپٹے نظاروں کی طرح ہیں ہم تم	۵۵
O22	لمس (نظم) 2	۵۶
O23	چشمِ بے خواب میں خوابوں کے ستارے چمکے	۵۷
O24	وسیلۂ سفر آسمان ڈھونڈتے ہیں	۵۹
O25	نئے غموں نئی خوشیوں کی رہگذار میں ہوں	۶۱
O26	خوش رنگ موسموں کے نظارے تھے آنکھ میں	۶۳
O27	شدتِ درد سے نہ مر جاؤں	۶۵
O28	پل پل درد کے دھارے میں ہے	۶۷
O29	نام کو بھی مری پلکوں پہ ستارہ نہیں تھا	۶۹
O30	جدا ہونے سے پہلے (نظم) 3	۷۱
O31	تمہارے شہر کے دیوار و در سلامت ہیں	۷۳
O32	اس آئینے کا طلب گار ہے بھی اور نہیں بھی	۷۵
O33	تجھ سے بچھڑ کے دوست جیا بھی جا سکتا ہے	۷۷
O34	ہمارے ساتھ دلآزار گفتگو بھی کر	۷۹
O35	خدایا خواب ہیں ہمارے اور بھی	۸۱
O36	اُس نے اک بار تو بچالی تھی	۸۳
O37	خاموشی میں اِک آوازہ ہوتا ہے	۸۵
O38	پرانے خواب کی تعبیر بنتی جاتی ہے	۸۷

○ 39	انجانے لوگوں میں دریا بانٹنے والے	۸۸
○ 40	ہونٹ پتھر ہیں سارے لوگوں کے	۸۹
○ 41	یہاں خوشبو نہیں رہتی (نظم)	۹۱
○ 42	جو شاخ شاخ کھلے تھے گلاب ٹوٹ گئے	۹۳
○ 43	ایک تو پوری کہانی بھی نہیں جانتا میں	۹۵
○ 44	یہ تو ہونا تھا ہو گیا آخر	۹۷
○ 45	نظر سے دور ہوں لیکن دکھائی دے رہا ہوں	۹۸
○ 46	جو بھی منظر ہے پس منظر ہو جائے گا	۹۹
○ 47	تابش مہر و ماہ سے پہلے	۱۰۱
○ 48	مجھ سے تنہا یہ نظارہ نہیں دیکھا جاتا	۱۰۳
○ 49	گیت	۱۰۵
○ 50	خواب یا خواب کا امکان کوئی بھی تو نہیں	۱۰۶
○ 51	کوئی دیوار تو ہے کوئی در تو ہے مرے پاس	۱۰۷
○ 52	علامتوں بھری زنبیل میں بھی کچھ نہیں تھا	۱۰۸
○ 53	وہ تتلی ہے (نظم)	۱۰۹
○ 54	خواب میں تیری شکل سمو نہیں سکتا میں	۱۱۱
○ 55	اُس کی چاہت سے انکار نہیں کر سکتا	۱۱۳
○ 56	زمیں کچھ اور ہی تھی آسماں کچھ اور ہی تھا	۱۱۵
○ 57	یہ سب جمال اُسی کا جمال ہے مرے دل	۱۱۷
○ 58	یہ میں جو اک بار بات کرنے کا سوچتا ہوں	۱۱۹

○59	خدا گواہ ہمیں تو خیال تک نہیں تھا	۱۲۱
○60	ضرورت کے لیے دامن کشا کرنے نہیں دیتی	۱۲۲
○61	نہ جانے کون سے جذبے کی رو میں بہہ گیا میں	۱۲۳
○62	اس کی آنکھوں میں وہ تصویر ہی رہ جاتی مری	۱۲۵
○63	فردیات	۱۲۷

حرفِ سادہ اور اعجاز کا رنگ

معروف نقاد محمد حسن عسکری رقم طراز ہیں کہ مستثنیات سے قطع نظر ہماری غزل انسان کے علاوہ کائنات کی کسی اور چیز سے تعلق نہیں رکھتی۔ اگر چیزوں کو استعمال بھی کرتی ہے تو انسانی جذبات و تصورات کے نائب کی حیثیت سے، یا یوں کہیے کہ غزل چیزوں کو دیکھتی نہیں، انھیں استعمال کرتی ہے۔ مثنویوں اور قصے کہانیوں میں البتہ چیزوں کو دیکھا جاتا ہے لیکن یہاں بھی چیزوں کا الگ اور مستقل وجود تسلیم نہیں کیا جاتا، ان کا شمار انسانی زندگی کے مناسبات میں ہوتا ہے۔

محمد حسن عسکری نے اس چھوٹے سے پیراگراف میں غزل کے مجموعی مزاج اور تکنیک کو ہمارے سامنے رکھ دیا ہے، غزل کی تاریخ میں ہم جھانکتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ غزل میں ہر وہ مضمون اور تجربہ ناکام ٹھہرا ہے جس کا انسانی جذبات اور لطیف حسیات کے ساتھ رشتہ گہرا نہیں تھا، غزل کی اسی گہری داخلیت نے اسے باقی اصناف سے منفرد رکھا، غزل کی چار سو سالہ زندگی کے پیچھے اسی گہری داخلیت کا عمل دخل نظر آتا ہے ورنہ غزل آج قصۂ پارینہ بن چکی ہوتی۔

غزل خارجی زندگی کے حقائق کو اپنے فن میں سمیٹنے سے پہلے ان کو داخلی شعری تجربہ کا حصہ بناتی ہے اور اسے اپنے مزاج میں پوری طرح آمیخت کر کے استعمال کرتی ہے۔

غزل کی ہیت میں موجود جن پابندیوں کو اس کی محدودیت پر محمول کیا جاتا ہے وہی پابندیاں (ردیف، قافیہ، بحر) دراصل مضامین تازہ کا باعث بنتی ہیں اور بعض اوقات ردیف اور قافیہ باہم مل کر ایک نئے جہانِ معنی کو جنم دیتے ہیں اور یہ پابندی نعمت محسوس

ہونے لگتی ہے۔

گو کہ ہر شعری صنف میں قوتِ متخیلہ کی بیداری اہم حیثیت رکھتی ہے مگر صنف غزل میں اس کو جو مرکزیت حاصل ہے وہ کسی اور صنف شعر میں نظر نہیں آتی۔ یوں سمجھئے کہ غزل میں اس کی حیثیت بدن میں روح کی طرح ہوتی ہے،باقی اصناف میں متخیلہ کی کمزوری کے باوجود کام چل سکتا ہے مگر غزل میں اس قوت کی کمزوری مکمل ناکامی پر منتج ہوتی ہے۔

غزل کی تاریخ نشیب و فراز سے بھری ہوئی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ یہ صنف کبھی پس منظر میں چلی گئی اور کبھی پورے منظر پر چھاگئی لیکن ایک بات طے ہے کہ غزل نے ہر عہد میں اپنے وجود کو پوری توانائی کے ساتھ ثابت کیا، آپ اردو شاعری کے جتنے چاہیں، ادوار قائم کر لیں ، حلقہ اربابِ ذوق اور ترقی پسند تحریک کے زمانے کو لے لیں یا نئی لسانی تشکیلات کی تحریک کے عہد کو لے لیں، ہر دور میں ہمیں ایک سے زیادہ اہم غزل گو نظر آتے ہیں جنھوں نے غزل کے فن کو نہ صرف قائم رکھنے کے لیے سعی کی بلکہ اس میں کسی نہ کسی حد تک اضافے بھی کیے۔

ترقی پسند تحریک کے عروج میں ہمیں جگر مراد آبادی ، فراق گورکھپوری ، اصغر گونڈوی ، فیض احمد فیض اور ناصر کاظمی جیسے غزل گو نظر آتے ہیں جنھوں نے نہ صرف اپنے عہد کی تہذیبی و جذباتی زندگی کی بھرپور نمائندگی کی بلکہ قارئین کے ایک وسیع حلقہ کو متاثر کیا۔

۱۹۶۰ء میں جب مغربی ادب کا بہ نظر عمیق مطالعہ کرنے والے چند اہل قلم نے نئی لسانی تشکیلات کے لیے کوششوں کا آغاز کیا، تو اردو شاعری کی پرانی لفظیات کو انھوں نے خاص طور پر نشانہ بنایا۔ ردیف قافیہ کی پابندی تو پہلے ہی آزاد نظم کے ذریعے اٹھ چکی تھی، ان لوگوں نے نثری نظم کے ذریعے اردو شاعری کو مزید آزادیاں فراہم کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔

اس تحریک نے عملی طور پر غزل کی ہیئت کو مسترد کر دیا، اور نظم کو مستقبل کی صنف شعر قرار دیا اور یہ کہا کہ غزل آنے والے دور کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور چونکہ یہ صنف ترجمہ نہیں ہو سکتی اس لیے عالمی ادب کے دھارے میں شامل ہونے کی اہل نہیں ہے۔

یہ رجحان تو جیسے ابھرا تھا، اسی طرح ختم ہو گیا اور ناکامی اس کا مقدر ٹھہری مگر اس دور میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اردو غزل کو چند ایسے فن کار میسر آئے جن کی کوششوں نے اردو غزل کو جدید عہد کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح مالا مال کیا اور اس پر مستزاد یہ کہ انقلابی تبدیلیوں کے باوجود غزل غزل ہی رہی۔ اس دور میں ظفر اقبال، شکیب جلالی، شہزاد احمد، احمد فراز اور ڈاکٹر خورشید رضوی اہم غزل گوؤں کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے۔ شکیب جلالی کو زندگی نے مہلت نہ دی جب کہ باقی لوگ تقریباً نصف صدی کے سفر کے باوجود اب بھی توانا نظر آتے ہیں۔

گو کہ غزل کے فن میں کلاسیکی لفظیات، تراکیب اور مصرع سازی کا رجحان ہمیں ہر عہد میں نظر آتا ہے مگر ۱۹۸۰ء کے بعد کی غزل میں غالب کے اسلوب کی پیچیدگی اور تہہ داری نے خاص اہمیت اختیار کی اور رنگِ غالب کو آگے بڑھانے والے شعرا کی ایک معقول تعداد سامنے آئی۔ دوسری طرف حرفِ سادہ کو اعجاز کا رنگ عطا کرنے والے بھی ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں۔ غزل گوؤں کا دوسرا گروہ مصرع سازی اور کرافٹنگ کی بجائے اپنی تمام تر توجہ تخلیقی الاؤ اور باطن کے شعری تجربہ کی جانب مرکوز رکھے ہوئے گلہائے رنگ رنگ کھلانے میں مشغول نظر آتا ہے۔

نوید رضا کی غزل گوئی کا آغاز ۱۹۸۸ء کے قریب ہوا اور وہ بھی غزل گوئی کے اسی دوسرے گروہ کا رکن ہے جو اپنے شعری تجربہ اور تخلیقی الاؤ کے باعث حرفِ سادہ کو اعجاز کا رنگ عطا کرنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ نوید رضا کی شاعری اس بات کا اعلامیہ ہے کہ نئی بات کرنے کے لیے روایتی لفظیات کو توڑنا پھوڑنا ضروری نہیں ہے۔ اگر کہنے کے لیے

بات ہو تو انھیں الفاظ کے باطن سے نئے جہانِ معنی نمودار ہو سکتے ہیں اور یہی لفظ نیا منظر نامہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ نوید رضا کے یہ شعر پڑھیے اور تصدیق کیجئے کہ اس نے حرفِ سادہ کو اعجاز کا رنگ عطا کر دیا ہے :

کچھ اس طرح سلا دیا گیا مجھے
کہ جاگنا بھلا دیا گیا مجھے
میں خود کو دوسروں سے کیا جدا کروں
بہت ملا جلا دیا گیا مجھے
نہ جانے یہ نمی کہاں سے آ گئی
نہ جانے کب رلا دیا گیا مجھے
میں تو اپنے آنسوؤں سے شرمندہ ہوں
تیری آنکھ کے آنسو رو نہیں سکتا میں

+ خواب اور شکست خواب نوید رضا کی شاعری میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، اس کے خواب زندگی کی طرح ہمہ رنگ، ہمہ صفت اور ہمہ جہت ہیں، وہ اچھے کل کے خواب دیکھتا ہے اور پھر اس کی تعبیر کے لیے سرگرم ہو جاتا ہے۔ جب ساری کوشش کے باوجود یہ خواب بکھر جاتے ہیں تو محض ایک لمحہ کے لیے افسردہ ہوتا ہے، رائیگانی کے احساس میں مبتلا ہوتا ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اگلے ہی لمحے وہ کسی نئے خواب کے لیے سرگرم ہو جاتا ہے۔

نوید رضا کے ہاں خواب تحریک اور زندگی کی علامت بن کر ابھرتے ہیں جن میں امید اور رجائیت نمایاں ہوتی ہے، اس کے ہاں خواب اور شکست خواب کے منظر تخلیقی وفور سے مملو ہیں۔ اسی ہمہ رنگ تخلیقی وفور کا نتیجہ ہے کہ اس کے ہاں غزل کا ایک منفرد منظر نامہ ابھرتا ہے۔

نوید رضا کی شاعری ایک وسیع و عریض خواب کا منظر نامہ ہے، اس کی آواز اس کا لہجہ

کسی نیم خوابیدہ ساعت سے ابھرتا ہے، اس کی آواز نرم، گداز اور دل میں اتر جانے کی صلاحیت سے مالامال ہے۔ زندگی کے تلخ تر حقائق کو بھی وہ شعری تجربہ میں ڈھال کر ایک خلاقانہ غم کی شکل دے دیتا ہے۔ اب آیئے اس کے کچھ رنگارنگ خواب دیکھئے جو شعری پیکروں میں ڈھل کر زیادہ خوب صورت ہو گئے ہیں۔

تو مرے خواب کی پناہ میں تھا
بازوؤں کی پناہ سے پہلے
ہمارے طے شدہ نہیں ہیں راستے
کہ ہم تو دیکھتے ہیں نقشِ پائے خواب

نوؔید رضا کی شاعری میں شکست خواب کا المیہ بھی پورے تخلیقی رنگ و روپ کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اور قاری کو شاعر کے ٹوٹے ہوئے خوابوں میں اپنے خوابوں کی کرچیاں بھی شامل نظر آتی ہیں۔ یوں شاعر کے شکستِ خواب کا منظر ایک وسیع تر مفہوم اور آفاقیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس منظر میں ہمیں انسانی زندگی کے خوابوں کی شکست و ریخت کی عالمی صورتِ حال نظر آنے لگتی ہے اور یوں اس کا غم پوری انسانی برادری کے غم کا پرتو بن جاتا ہے۔ شکست خواب کے اس منظر میں سب نقوش پوری طرح نمایاں نظر آتے ہیں

جو شاخ شاخ کھلے تھے گلاب ٹوٹ گئے
اک ایک کر کے مرے سارے خواب ٹوٹ گئے
یہ اب جو دیکھ رہے ہو یہ کچھ نیا تو نہیں
یہ زندگی کا تماشہ گذشتہ سال بھی تھا
ستارے ٹوٹ کے گرنے سے پیشتر اے کاش
تم آ کے دیکھتے یہ آسماں کچھ اور ہی تھا

نوؔید رضا کی شاعری میں پوری توانائی سے ابھرنے والے استعارات میں رات،

خواب اور اس کے متعلقات کا پر تو موجود ہوتا ہے۔ اس کے ہاں ستارہ ایک خوب صورت استعارہ کے طور پر ابھرتا ہے اور یہ استعارہ بھی ہمیں کسی خواب کا حصہ محسوس ہوتا ہے۔ اس استعارہ کی مختلف جہات نظر آتی ہیں۔ ہر بار یہ استعارہ ایک نئے منظر نامہ کی تشکیل کرتا ہے۔ کہیں یہ امید کی علامت ہے، کہیں پر، محبوب ہے، کہیں آنسو ہے اور کہیں خواب ہے جو شاعر کی آنکھ تک ابھی نہیں پہنچا۔ اس استعارہ کو مختلف اشعار میں دیکھئے اور شاعر کی تازہ کاری کا لطف اٹھایئے۔

وہ اک ستارہ گر گیا تو کیا ہوا
کہ آسماں پہ ہیں ستارے اور بھی
ہمارا غم تو جیسے اک ستارہ تھا
جسے اب آفتاب کر رہا ہے وہ
نام کو بھی مری پلکوں پہ ستارہ نہیں تھا
آج کی رات نہ روتا تو گزارا نہیں تھا

آپ نے محسوس کیا کہ ان اشعار میں رات اور خواب کے رنگ کتنے نمایاں ہیں، وہ تمام جزئیات جو رات، نیند اور خواب کی تکون کو مکمل کرتی ہیں، ان اشعار کی تمثال میں کسی نہ کسی رنگ میں داخل ہو گئی ہیں۔

خواب زندگی کا لازمہ ہیں، خواب زندگی کا حوصلہ فراہم کرتے ہیں، خواب نئے جہانوں کی تلاش کا عمل جاری رکھتے ہیں۔ خواب انسان کا تعلق مادیت سے توڑ کر روحانیت کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ نوید رضا کے ہاں خواب ایک بھرپور استعارے کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں اور چپکے چپکے اس کے سارے شعری منظر کو اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں، اس پر مستزاد یہ کہ نوید رضا کے خواب کسی محدود فضا اور منظر کی تشکیل نہیں کرتے بلکہ زندگی کی وسعت اور بے کرانی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

غزل کی روایت میں سمانے والا محبت کا تجربہ بھی خواب و خیال کے درمیان جنم لیتا

اور نشو و نما پاتا ہے۔ محبت کا زمینی تصور غزل کے مزاج پر پورا نہیں اترتا، اس لیے غزل میں عشق کا تصور رومانی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ محبت کی ماورائیت اور لطافت دراصل غزل کے بنیادی مزاج کا لازمہ ہے، نوید رضا کے ہاں بھی محبت کا رومانی تصور ابھرتا ہے اور یہ تجربہ بھی کسی خواب نگر کا ہی کوئی گوشہ محسوس ہوتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اردو غزل میں عشق کا عمل دخل اس کی تاریخ جتنا قدیم ہے مگر اس جذبہ کے خدوخال کی کشش اور رعنائی میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اس کے اظہار کے بدلتے ہوئے قرینے اس کی آفاقیت کی گواہی ہیں۔

نوید رضا کے ہاں محبت کا تصور کبھی ایک نکتہ پر سمٹ جاتا ہے اور کبھی یہ پھیل کر کائنات اور پوری انسانی زندگی کو اپنے دامن میں سمولیتا ہے، محبت کے جذبہ کی یہ ہمہ گیریت آج کی غزل میں ہمیں کم کم شعرا کے ہاں ملتی ہے جس سے نوید رضا کی غزل مالامال ہے۔ اب ذرا محبت کے جذبہ کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے میں آپ کو اس سمندر کی سیاحی کو لیے چلتا ہوں جہاں محبوب اور محبت دونوں موجود ہیں۔

وہ پیاس تھی مرے اندر کہ میں تو مر جاتا
بچا لیا ہے ان آنکھوں کی آبجو نے مجھے

فصیل دل میں سماعت کا کوئی روزن کھول
زبان چشم سے دھیمی سے گفتگو بھی کر

وہ دوستی بھی نہیں تھی وہ دشمنی بھی نہ تھی
تمھارے اور مرے درمیاں کچھ اور ہی تھا

وہ آنکھوں کو نہیں پڑھتا سو اب ساری کہانی
در و دیوار پر تحریر کرنا چاہتا ہوں

انجانے لوگوں میں دریا بانٹنے والے
پانی کی اک بوند ہمارے پیالے میں بھی

اب ایسا لگتا ہے جیسے تری محبت بھی
ہمارے پاؤں کی زنجیر بنتی جاتی ہے

نوید رضا خوابوں سے قربت کے باوجود خارجی دنیا کے ساتھ مربوط نظر آتا ہے، اس کے ہاں خارجی حقائق اور مظاہر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے چینی، رائیگانی، عصری شعور اور شعورِ ذات بڑے توانا انداز میں ابھرتے ہیں۔ یہاں پر شاعر رومانیت کا لبادہ اتار کر پوری طرح حقیقت پسند نظر آنے لگتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جب نوید رضا کی شاعری ایک لمحے کے لیے دل سے دماغ کی طرف جست بھرتی ہے، غزلوں کے اشعار میں چلتے چلتے کسی مقام پر وہ اس خوب صورتی سے خارجی حقائق کی تصویر پیش کرتا ہے کہ غزل کے مزاج اور ماحول میں کسی قسم کا ارتعاش اور خلا پیدا نہیں ہوتا، قاری کو دل سے دماغ کی طرف ایسی زقند نہیں بھرنا پڑتی کہ وہ غزل کے مجموعی ماحول سے بالکل لاتعلق ہو جائے۔

اجڑ گئے تو یہی سوچا آخرش کہ چلو
ہمارے گھر بھی کسی کربلا کا رزق ہوئے
کسے بتائیں کہاں ہیں ہمارے نقش و نگار
کسے خبر ہے کہ کس نقش پا کا رزق ہوئے
اب تو لگتا ہے کہ ہستی بھی خلا ہے جس میں
تیرتے پھرتے ستاروں کی طرح ہیں ہم تم
جانے کس راہ کے مسافر ہیں
ہوتے جاتے ہیں روز و شب رخصت

عصری شعور اور عصری آشوب دونوں کا فنکارانہ اظہار نوید رضا کی غزلوں میں ملتا ہے، وہ عصری مسائل و مصائب کو بڑی ہمدردی اور کرب کے ساتھ دیکھتا ہے اور اپنے شعری تجربہ کا حصہ بناتا ہے۔ اس کی غزلوں میں ہمارا عہد سانس لیتا ہے، جس کو ایک سچے فنکار نے پورے رنگوں کے ساتھ مجسم کر دیا ہے۔

وہ ایک در بھی پانیوں کے رخ پہ تھا
جو ایک در کھلا دیا گیا مجھے

کل پھر وہ آنسوؤں کی روانی میں بہہ گئے
کل پھر جو تیرے نقش ابھارے تھے آنکھ میں

مجھ کو معلوم تو ہے دشت کی ناراضی کا
کیا کروں خاک اڑانی بھی نہیں جانتا میں

شاعری دراصل تمثال کاری کا فن ہے، شاعر کی بنائی ہوئی تصاویر جتنی مکمل اور جاذبِ نظر ہوں گی، وہ اپنے فن میں اتنا ہی کامیاب متصور ہوگا۔ اردو شاعری کی امیجری کو راشدؔ سے لے کر آج کے عہد کے کئی شعرا نے ایک فالتو، بے کار اور جمود پیدا کرنے والی چیز گردانا ہے مگر مشاہدہ میں یہ بات آئی ہے کہ یہ لوگ تمثال کاری کے فن سے پوری شعوری کوشش کے باوجود دامن نہ بچا سکے، جہاں انھوں نے اس سے شعوری طور پر کنارہ کیا وہاں شاعری رخصت ہو گئی اور ذہنی ورزش کے نقوش زیادہ ابھر آئے۔

نویدؔ رضا کے ہاں امیجری کا یہ عمل کسی بنے بنائے فارمولا کا نتیجہ نہیں ہے، یہ عمل مصنوعی نہیں بلکہ اس کے شعری وجدان اور تخلیقی تجربہ کا لازمی حصہ نظر آتا ہے اسی لیے نویدؔ رضا کی تمثال کاری میں ایک فطری حسن اور خوب صورتی موجود ہے۔ یہ تمثال شعر میں ایک نئے ذائقے کو جنم دیتی ہیں اور مظاہر قدرت اور کائنات کو ایک نئے زاویے سے paint کرتی ہیں۔

کسی نے وقت کی تسبیح توڑ ڈالی ہے
ہمارے صحن میں آ کر گرا ہے دانۂ شام

فلک سے ٹوٹ کے تارے زمیں پہ گرنے لگے
بس ایک آن میں خالی ہوا خزانۂ شام

ایک خواہش ہے کسی روز یہ دل کا سورج
تن سے تاریکی کا ملبوس اتارے، چمکے

چند ایک صبحیں اب بھی مری دسترس میں ہیں
تیری گرہ میں اب بھی کوئی شام ہے تو لا

نویدؔ رضا کی شاعری میں اس کی انانیت، نارسائی، تاریخی شعور، جدید لفظیات کے

اشارے اور عملِ تحرک بھی ملتے ہیں، جن کا الگ الگ ذکر طوالت کے خوف سے نہیں کیا جارہا، محض چند اشعار پیش کیے جارہے ہیں :

وسیلۂ سفر آسمان ڈھونڈتے ہیں
پرندے اپنے پروں میں اڑان ڈھونڈتے ہیں

مرے چاروں طرف نوحہ گروں کی بستیاں ہیں
میں ان کو دعوت نغمہ سرائی دے رہا ہوں

اور اب تو اس قدر خائف ہوں بے دستک کواڑوں سے
کہ میں جب بھی بناؤں خانۂ بے در بناتا ہوں

اس ساری عرق ریزی کے بعد قاری کے ذہن میں یہ سوال ابھر سکتا ہے کہ نوید رضا کے ہاں وہ کون سی انفرادیت ابھرتی ہے، جو اس کو الگ پہچان عطا کردے تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ بہر حال نوید رضا کے ہاں ہمیں کسی ایسے شاعر کی چاپ سنائی نہیں دیتی جو لمحہ موجود میں اپنے شعری لہجہ اور اسلوب کے حوالے سے زندہ اور زیر بحث ہے۔ یہ بات اس کے لیے بڑا کریڈٹ ہے۔ یہی بات آگے چل کر اس کی انفرادیت کے نقوش وضع کرے گی۔ کیوں کہ ہمارے ہاں نوجوان غزل گوؤں کی ایک کثیر تعداد کے ہاں کسی نہ کسی زندہ شاعر کے نقوش نمایاں نظر آتے ہیں۔ نوجوان شعرا کا ایک بڑا حلقہ تو محض ایک شاعر کے بنے بنائے لہجہ اور اسلوب میں طبع آزمائی کیے جارہا ہے، اس احساس کے بغیر کہ ان کی اپنی آواز کہیں گم ہو رہی ہے۔

نوید رضا کسی تقلید اور نقالی کے بجائے اپنے اندر کی قوت تخلیق پر نظریں جمائے ہوئے چل رہا ہے، وہ کسی چراغ سے روشنی مستعار لینے کے بجائے اپنے چراغ کی لو کو بڑھانے کی جستجو اور کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں وہ بعض جگہوں پر بالکل انفرادیت حاصل کرلیتا ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ نوید رضا آنے والے دنوں میں شاعری کا ایک جہانِ دگر آباد کرنے میں کامیاب و کامران ٹھہرے گا۔

ارشد نعیم

۲۰/اگست ۲۰۰۰ء

☆

راہ چلتے ہوئے وہ یونہی دوبارہ مل جائے
شام کو جیسے کوئی صبح کا تارا مل جائے

ناؤ بن جائے کوئی شور مچاتی ہوئی لہر
کیا خبر ڈوبنے والوں کو کنارا مل جائے

اور پھر ایسا مقدر بھی کہاں ہے اپنا
کہ دیا ڈھونڈنے نکلیں تو ستارا مل جائے

کس قدر روشنی ہوتی تھی مری آنکھوں میں
کاش وہ کھویا ہوا خواب دوبارہ مل جائے

ڈھونڈنے والا کوئی ہو تو بہت ممکن ہے
اس خرابے میں کوئی نقش ہمارا مل جائے

☆

جُدا ہوئے تو جُدائی میں یہ کمال بھی تھا
کہ اُس سے رابطہ ٹوٹا بھی تھا بحال بھی تھا

وہ جانے والا ہمیں کس طرح بھلائے گا
ہمارے پیشِ نظر ایک یہ سوال بھی تھا

یہ اب جو دیکھ رہے ہو یہ کچھ نیا تو نہیں
یہ زندگی کا تماشا گزشتہ سال بھی تھا

یہ داغ لکھا تھا سیلاب کے مقدر میں
مرا مکان تو پہلے سے خستہ حال بھی تھا

نویدِ ترکِ تعلق پہ خوش تو تھے لیکن
جو سچ کہیں تو طبیعت میں کچھ ملال بھی تھا

☆

اکیلے ہم ہی نہیں اس بلا کا رزق ہوئے
ہرے بھرے کئی پتے ہوا کا رزق ہوئے

اُجڑ گئے تو یہی سوچا آخرش کہ چلو
ہمارے گھر بھی کسی کربلا کا رزق ہوئے

وہ سنگِ دَر تو نہ سرکا پر اپنے سارے لفظ
اک ایک کر کے ہماری دعا کا رزق ہوئے

کسے بتائیں کہاں ہیں ہمارے نقش و نگار
کِسے خبر ہے کہ کِس نقشِ پا کا رزق ہوئے

قصور اسکا نہیں تھا نوید اب کے بھی
ہمارے خواب ہماری انا کا رزق ہوئے

☆

مسلسل اجتناب کر رہا ہے وہ
ہمارا احتساب کر رہا ہے وہ

ضرور کوئی معجزہ ہے اس کے پاس
کہ خار کو گلاب کر رہا ہے وہ

ہمارا غم تو جیسے اک ستارہ تھا
جسے اب آفتاب کر رہا ہے وہ

نظر نہ آنا بھی تو ایک جُرم ہے
اور اس کا ارتکاب کر رہا ہے وہ

ہمارے پاس جب دعا نہیں رہی
دعائیں مُستجاب کر رہا ہے وہ

☆

میں پہلے تو کوئی تصویر کاغذ پر بناتا ہوں
پھر اک تصویر اس تصویر کے اندر بناتا ہوں

بہت سے خواب پہلے توڑ لیتا ہوں ہتھیلی پر
پھر ان کو دیکھ کر چہرے پہ چشمِ تر بناتا ہوں

ہوا کی راہ میں قندیل ہو جاتا ہوں پہلے اور
پھر اپنے ہاتھ سے دل میں ہوا کا ڈر بناتا ہوں

ذرا اِن ہجرتوں کی قید سے آزاد ہو جاؤں
پھر آ کے دیکھنا یارو میں کیسا گھر بناتا ہوں

کہاں سے آئے گی مصروفیت بے روز گاری میں
یونہی بے کار بیٹھا ذہن میں دفتر بناتا ہوں

اور اب تو اسقدر خائف ہوں بے دستک کواڑوں سے
کہ میں جب بھی بناؤں خانہ ءِ بے در بناتا ہوں

نوید اب کے غزل کے شہر پر قبضہ جمانا ہے
کہ اب شام و سحر الفاظ کا لشکر بناتا ہوں

☆

نوید ہو اے چشمِ آشنائے خواب
کہ پھر سے ہو رہی ہے ابتدائے خواب

ہمارے طے شدہ نہیں ہیں راستے
کہ ہم تو دیکھتے ہیں نقشِ پائے خواب

نظر میں کوئی رنگ ہے نہ روشنی
نظر کو کر لیا ہے ماورائے خواب

ہماری پیاس مار ڈالے گی ہمیں
جو خشک ہو گئی یہ آبنائے خواب

خدایا! خیر ہو نہ جانے کیا ہوا
خموش ہو گئی سخن سرائے خواب

تم اب بھی خوبصورت ہو

تمہاری سرمئی مخمور آنکھوں میں کبھی جو روشنی سی جھلملاتی تھی
وہ اب بھی جھلملاتی ہے
تمہارے ہونٹ پہلے کی طرح اب بھی پھلوں
کو ذائقے تقسیم کرتے ہیں
تمہاری چال اب بھی میری غزلوں میری نظموں
کو حسیں بحریں
عطا کرنے پہ قادر ہے

تمھاری دل نشیں آواز میں وہ نغمگی اب بھی سلامت ہے
تمھاری سرد سانسوں میں کبھی جو آنچ تھی
وہ آج بھی ویسی کی ویسی ہے
تمھاری زلف کا سایہ ہمیشہ کی طرح گہرا ہے
بالکل بھی نہیں بدلا

جو سچ پوچھو
تو پہلے کی طرح تم آج بھی میری ضرورت ہو
تم اب بھی خوبصورت ہو

☆

میں کیوں اداس ہوں یاروں سے پوچھتا رہا میں
خزاں کی بات بہاروں سے پوچھتا رہا میں

ہمارے شہر پہ اب کس کا حکم چلنا ہے
بہ روزِ فتح سواروں سے پوچھتا رہا میں

نکل گیا تھا کہیں چاند کچھ بتائے بغیر
تمام رات ستاروں سے پوچھتا رہا میں

وہ ایک بات جو دریا سے پوچھنا تھی مجھے
وہ بات اس کے کناروں سے پوچھتا رہا میں

گزرنے والے کسی قافلے کی کوئی خبر
اداس راہ گزاروں سے پوچھتا رہا میں

☆

شکست مان لوں یہ کام بھی نہیں ہوتا
یہ کارنامہ سر انجام بھی نہیں ہوتا

عجب نصیب ہے اس دل کے آسماں کا نصیب
کوئی ستارا کسی شام بھی نہیں ہوتا

جو کام کرنے لگیں کام بھی نہ کرپائیں
جو بیٹھ جائیں تو آرام بھی نہیں ہوتا

تمہارا طعنہ و دُشنام بھی غنیمت ہے
کبھی یہ طعنہ و دُشنام بھی نہیں ہوتا

وہ آ بھی جاتا ہے گرچہ ہماری باتوں میں
صحیح طرح سے مگر رام بھی نہیں ہوتا

گلہ گزار بھی ہوتا ہوں میں ترا لیکن
کبھی زباں پہ ترا نام بھی نہیں ہوتا

☆

نام رخصت ہوا نسب رخصت
ہو گیا اپنا سب کا سب رخصت

جلتے بجھتے چراغ ہیں ہم تم
جانے ہو جائے کون کب رخصت

وقت آنکھوں میں جم گیا تھا کہیں
مجھ سے وہ ہو رہا تھا جب رخصت

جانے کس راہ کے مسافر ہیں
ہوتے جاتے ہیں روز و شب رخصت

بس غم یار تھک گیا ہوں میں
بس غم روزگار اب رخصت

☆

بہتا دریا ہو یا سراب عذاب
خواب اور انتہائے خواب عذاب

سامنے آ کہ اب تو میرے لیے
بن گیا ہے ترا حجاب عذاب

زندگی کو سوال ہم نے کیا
وقت نے لکھ دیا جواب عذاب

تو نہیں ہے تو صحنِ گلشن میں
کوئی کانٹا ہو یا گلاب عذاب

☆

ترے دل کا ارادہ جانتا ہوں
تجھے تجھ سے زیادہ جانتا ہوں

محبت میں الٹ ہوتا ہے سب کچھ
زیاں کو استفادہ جانتا ہوں

سبھی آرائشوں سے ماورا ہے
تمہارا حسنِ سادہ جانتا ہوں

میں ستاتا نہیں ہوں شہسوارو
سو تم کو پا پیادہ جانتا ہوں

☆

جو داستاں ہے ابھی داستاں سے باہر ہے
ہمارا کرب ہمارے بیاں سے باہر ہے

دعا بَدست ہیں آنکھیں کہ وہ ستارہ صفت
بہت دنوں سے مرے آسماں سے باہر ہے

ہمارے گھر کو مکانوں میں ڈھونڈنے والے
ہمارا گھر تو ہمارے مکاں سے باہر ہے

جو ہو گیا ہے وہ وہم و گماں سے باہر تھا
جو ہونے والا ہے وہم و گماں سے باہر ہے

ترے خیال سے اس خاکداں میں روشنی تھی
ترا خیال اب اس خاکداں سے باہر ہے

کچھ اور سوچ کہ ترسیلِ نامہ وپیغام
بساطِ حلقۂ نامہ براں سے باہر ہے

☆

کچھ اس طرح سلا دیا گیا مجھے
کہ جاگنا بھلا دیا گیا مجھے

کوئی تو ہے جو اس کو یاد ہے بہت
یہ کس طرح بھلا دیا گیا مجھے

میں خود کو دوسروں سے کیا جدا کروں
بہت ملا جلا دیا گیا مجھے

نہ جانے یہ نمی کہاں سے آ گئی
نہ جانے کب رلا دیا گیا مجھے

وہ ایک در بھی پانیوں کے رُخ پہ تھا
جو ایک در کھلا دیا گیا مجھے

☆

اس کی گلی کا در ہے کوئی بام ہے تو لا
میخانہء خیال کوئی جام ہے تو لا

میرا نہیں تو مجھ کو بتا دے کہ بھول جاؤں
گر دل پہ تیرے نقش مرا نام ہے تو لا

بارطلب تو اب نہ اٹھا پاؤں گا مگر
ہاں زندگی اب اور کوئی کام ہے تو لا

اب تک نہیں گرا ہے مرے حوصلے کا قصر
تھوڑی سی اور گردش ایام ہے تو لا

چند ایک صبحیں اب بھی مری دسترس میں ہیں
تیری گرہ میں اب بھی کوئی شام ہے تو لا

کوئی رنج کوئی ملال ہو تو کمال ہو
کسی غم سے تُو بھی نڈھال ہو تو کمال ہو

یہی دوپہر یہی شہر ہجر کی دوپہر
یہی شامِ شہرِ وصال ہو تو کمال ہو

وہ نہ جی سکے گا کسی طرح مجھے بُھول کر
یہ خیال اُسکا خیال ہو تو کمال ہو

میں گزرتے وقت کا لمحہ لمحہ بدل سکوں
مرے ہاتھ میں یہ کمال ہو تو کمال ہو

☆

یہ راستہ بھی چلو اختیار کر دیکھیں
اُسے گماں کا لِبادہ اُتار کر دیکھیں

پلٹ کے آئے نہ آئے یہ اس کی مرضی ہے
ہم ایک بار تو اس کو پکار کر دیکھیں

وہ اعتماد تھا ہم میں کہ سوچتے تھے نویدؔ
ہر ایک راہ سے خود کو گزار کر دیکھیں

☆

یہی کہانی ہے اب تک یہی فسانہء شام
وہی چراغ وہی سنگِ آستانہء شام

ہمارا دل بھی اسی آفتاب جیسا تھا
سو کیا عجب ہے اگر ہو گیا نشانہء شام

اندھیرا، گہری اداسی ، خموشی ، تنہائی
تمہارے پاس یہی کچھ ہے کارخانہء شام

کسی نے وقت کی تسبیح توڑ ڈالی ہے
ہمارے صحن میں آ کر گرا ہے دانہء شام

فلک سے ٹوٹ کے تارے زمیں پہ گرنے لگے
بس ایک آن میں خالی ہوا خزانہء شام

☆

ذرا سا اور بھی رنجور ہونا چاہتا ہوں
مت آنا میں غموں سے چُور ہونا چاہتا ہوں

مرے اندر بھی کوئی سچ مچلتا ہے سو لوگو
کوئی سولی کہ میں منصُور ہونا چاہتا ہوں

مجھے لگتا ہے میری شاعری جاتی رہے گی
مجھے لگتا ہے میں مشہور ہونا چاہتا ہوں

طبیعت کو مری رسوائیاں بھاتی بہت ہیں
تمہارے شہر کا دستور ہونا چاہتا ہوں

محبت کو پرکھنے کا یہی اک راستہ ہے
سو اب کچھ دیر تم سے دُور ہونا چاہتا ہوں

☆

دُھند میں لپٹے نظاروں کی طرح ہیں ہم تم
یعنی مبہم سے اشاروں کی طرح ہیں ہم تم

آؤ سمجھائیں تمہیں اپنے تعلق کی مثال
نہر کے دونوں کناروں کی طرح ہیں ہم تم

اب تو لگتا ہے کہ ہستی بھی خلا ہے جس میں
تیرتے پھرتے ستاروں کی طرح ہیں ہم تم

اب اگر کوئی اِدھر آئے تو کیونکر آئے
گمشدہ راہ گزاروں کی طرح ہیں ہم تم

لمس

بادل اس چنچل وادی کا
جس دم ماتھا چوم رہے تھے
میرے ہونٹوں نے اس دم محسوس کیا تھا
لمس تری پیشانی کا

☆

چشمِ بے خواب میں خوابوں کے ستارے چمکے
عرصہء ہجر میں جینے کے اِشارے چمکے

ایک خواہش ہے کسی روز یہ دل کا سورج
تَن سے تاریکی کا ملبوس اُتارے چمکے

اے مری خاک اندھیروں سے نکل آ اب تو
میرے لُہوں سے ترے دریاؤں کے دھارے چمکے

بُجھ گیا چاند تو بُجھنے پہ تعجب کیسا
اب کہاں تک کوئی سورج کے سہارے چمکے

ایک لمحے کو نویدؔ اس کا خیال آیا تھا
رات بھر آنکھ میں اشکوں کے ستارے چمکے

☆

وسیلہء سفرِ آسمان ڈھونڈتے ہیں
پرندے اپنے پروں میں اڑان ڈھونڈتے ہیں

وہ جارہا تھا تو اس کا پتہ نہ پوچھ سکے
گلی گلی میں اب اُس کا مکان ڈھونڈتے ہیں

اگر کماں تھی تو ترکش میں تیر کوئی نہ تھا
اور اب کے تیر مِلے تو کمان ڈھونڈتے ہیں

ہمیں بھی نیزے پہ سچ بولنے کی خواہش ہے
ہم اہل سر بھی کوئی امتحان ڈھونڈتے ہیں

ضرورت آن پڑی ہے کسی گواہی کی
کہ شہر یار کوئی بے زبان ڈھونڈتے ہیں

وہ ایک سادہ حکایت نہیں سمجھ پاتے
جو داستان تہہِ داستان ڈھونڈتے ہیں

یہی بڑائی بہت ہے نویدؔ، غالبؔ کی
کہ اب بھی لوگ وہ طرز بیان ڈھونڈتے ہیں

☆

نئے غموں نئی خوشیوں کی رہ گزار میں ہوں
میں ایک تازہ محبت کے انتظار میں ہوں

تو مجھ کو جلتا ہوا چھوڑ دے کہ گل کر دے
ہوائے تیز میں اب تیرے اختیار میں ہوں

میں اِن کے ساتھ بڑی بے دلی سے اڑتا ہوں
کہ سب سے پیچھے پرندوں کی اس قطار میں ہوں

وہ جان بوجھ کے رستے کو طول دے دے گا
وہ جانتا ہے کہ میں اُس کے انتظار میں ہوں

کسی کی شکل بھی پہچان میں نہیں آتی
مرے خدایا میں کس اجنبی دیار میں ہوں

☆

خوش رنگ موسموں کے نظارے تھے آنکھ میں
جب بھی تمہارے خواب اتارے تھے آنکھ میں

چہرے پہ اس کے لکھی تھی اک بے تعلقی
لیکن محبتوں کے اشارے تھے آنکھ میں

اور عالم جنوں کی حکایات کیا لکھیں؟
گرداب میں تھا جسم کنارے تھے آنکھ میں

اپنے دکھوں پہ رونا تو کار فضول تھا
جب بے حساب درد کے مارے تھے آنکھ میں

کل پھر وہ آنسوؤں کی روانی میں بہہ گئے
کل پھر جو تیرے نقش ابھارے تھے آنکھ میں

☆

شدتِ درد سے نہ مر جاؤں
میں ہوں اک زخم کیوں نہ بھر جاؤں

ایک الزام بن گیا ہوں میں
سوچتا ہوں کہ کس کے سر جاؤں

اُسکی خاموشیوں میں زندہ ہوں
وہ اگر بول دے تو مر جاؤں

ایک لمحہ سمیٹ لے مجھ کو
چاہے اگلے ہی پل بکھر جاؤں

ایک نادار کی دعا ہوں میں
مجھ پہ لازم ہے بے اثر جاؤں

☆

پل پل درد کے دھارے میں ہے
ہاں انسان خسارے میں ہے

اتنی دور سے آنچ آتی ہے
کیسی آگ ستارے میں ہے؟

کٹتا ہے اور چپ رہتا ہے
کتنا ظرف کنارے میں ہے

کب سے نظریں جمی ہوئی ہیں
کون سی بات نظارے میں ہے

ہم جیسوں کا جینا مرنا
اس کے ایک اشارے میں ہے

☆

نام کو بھی مری پلکوں پہ ستارہ نہیں تھا
آج کی رات نہ روتا تو گزارہ نہیں تھا

ہاتھ گرداب سے ٹکرائے تو معلوم ہوا
ہم کنارا جسے سمجھے تھے کنارا نہیں تھا

روشنی پھیل گئی دل کے نہاں خانے تک
میں نے آنکھوں میں ابھی خواب اتارا نہیں تھا

واپس آئے تو یہ پیشانی لہو سے تر تھی
اس کے دروازے کا پتھر بھی ہمارا نہیں تھا

میں نے خوشیوں کی طرح اس کی حفاظت کی تھی
کون کہتا ہے ترا غم مجھے پیارا نہیں تھا

جدا ہونے سے پہلے

جدا ہونے سے پہلے
تم جو سننا چاہتی ہو
میں جو کہنا چاہتا ہوں مجھ کو کہنے دو
جدا ہونے سے پہلے
تم جو کہنا چاہتی ہو
میں جو سننا چاہتا ہوں مجھ کو سننے دو
نہ جانے پھر نیا موسم
جدائی کا نیا موسم ہم ایسے کم سخن لوگوں۔۔۔۔
کی کیا صورت بنا ڈالے

نہ جانے پھر جدائی کا نیا موسم ہمیں۔۔۔۔۔
اک دوسرے کی شکل سے نا آشنا کر دے
نہ جانے اس جدائی کے نئے موسم میں اپنی
مٹھیوں سے سچے لفظوں کے چمکتے سبز جگنو ایک
اک کر کے کسی بے نام منزل کی طرف پرواز کر
جائیں
سو اے ہمدم
جدا ہونے سے پہلے

تم جو سننا چاہتی ہو
میں جو کہنا چاہتا ہوں مجھ کو کہنے دو
جدا ہونے سے پہلے
تم جو کہنا چاہتی ہو
میں جو سننا چاہتا ہوں مجھ کو سننے دو

☆

تمہارے شہر کے دیوار و در سلامت ہیں
اسی لیے ہی تو ہم دربدر سلامت ہیں

جگہ جگہ پہ دراڑیں پڑی ہوئی ہیں مگر
تمہیں یہ زعم ہے یارو کہ گھر سلامت ہیں

قیامتیں جو گزرنی تھیں وہ گزر بھی گئیں
مگر دلوں میں تباہی کے ڈر سلامت ہیں

ابھی تو رنگ پہ آئے گا جشن مقتل کا
ابھی تو دوستو شانوں پہ سر سلامت ہیں

یہ زخم کس لیے تم کو نظر نہیں آتا؟
تمہارے چہرے پہ آنکھیں اگر سلامت ہیں

جو دیکھ سکتے ہیں وہ لوگ ریزہ ریزہ ہیں
نوید صرف یہاں بے بصر سلامت ہیں

☆

اس آئینے کا طلب گار ہے بھی اور نہیں بھی
وہ میرے دل کا خریدار ہے بھی اور نہیں بھی

کچھ اور لوگ بھی ایسے ہی دل کو کھینچتے ہیں
یہ دل تمہارا گرفتار ہے بھی اور نہیں بھی

نہ جانے کب کوئی تعمیر ابتدا ہو جائے
مکان بے درو دیوار ہے بھی اور نہیں بھی

نظر پڑے تو خموشی سے دیکھتا ہے مجھے
یہ ایک صورتِ اظہار ہے بھی اور نہیں بھی

اُسے خموش ہی رہنے دو جانے کیا کہہ دے
کہ وہ ہمارا طرفدار ہے بھی اور نہیں بھی

☆

تجھ سے بچھڑ کے دوست جیا بھی جا سکتا ہے
پینا ہو تو زہر پیا بھی جا سکتا ہے

اب کی بار تو خیر ہوا کو مات ہوئی ہے
لیکن اگلی بار دیا بھی جا سکتا ہے

تمہیں بُھلانا سہل نہیں پر تم چاہو تو
ایسا مشکل کام کیا بھی جا سکتا ہے

دل کا چاک ہمیشہ دل کے ساتھ رہے گا
جیب کا چاک تو خیر سیا بھی جا سکتا ہے

خاموشی کا صرف یہی مفہوم نہیں ہے
لیکن یہ مفہوم لیا بھی جا سکتا ہے

☆

ہمارے ساتھ دل آزار گفتگو بھی کر
تمام لوگ یہی کر رہے ہیں تو بھی کر

فصیلِ دل میں سماعت کا کوئی روزن کھول
زبانِ چشم سے دھیمی سی گفتگو بھی کر

بَس ایک سجدے سے مسجُود خوش نہیں ہو گا
سو اپنے خون سے پہلے ذرا وضو بھی کر

فضا کو دلکش و رنگین کر اُڑا آنچل
یہ زلف کھول ہواؤں کو مشکبوُ بھی کر

ضرور دل میں کسی دوسرے کی خواہش رکھ
پر اسکے ساتھ ذرا اُسکی جستجو بھی کر

☆

خدایا خواب ہیں ہمارے اور بھی
نظر کچھ اور بھی نظارے اور بھی

وہ اک ستارا گر گیا تو کیا ہوا؟
کہ آسماں پہ ہیں ستارے اور بھی

یہ ابتدائے کاروبارِ عشق ہے
ابھی تو آئیں گے خسارے اور بھی

رُکوں تو جانے کے لیے کہے مجھے
چلوں تو زور سے پکارے اور بھی

ہوا ہی سست ہو گئی تھی دوستو
وگرنہ مجھ میں تھے شرارے اور بھی

☆

اس نے اک بار تو بچا لی تھی
ناؤ پھر ڈوب جانے والی تھی

بے نیازی ہو یا تغافل ہو
اُس کی ہر بات ہی نِرالی تھی

رات بھی تھی سیاہ پوش مگر
چاند کی روشنی بھی کالی تھی

کیا مٹاتی وہ خالی پن میرا
وہ تو اندر سے آپ خالی تھی

ہاں اسے بُھول بھی گیا تھا میں
دودُھ کی نہر بھی نکالی تھی

جب اُسے پہلی بار دیکھا تھا
سیدھی سادھی تھی بھولی بھالی تھی

☆

خاموشی میں اک آوازہ ہوتا ہے
اس دیوار میں بھی دروازہ ہوتا ہے

ہاں بھئی اپنے خواب تو دینے پڑتے ہیں
زندہ رہنے کا خمیازہ ہوتا ہے

میں کب اس کے آنسو دیکھنے جاتا ہوں
اس کی آنکھوں سے اندازہ ہوتا ہے

وہ بھی میرے جیسی باتیں کرتا ہے
لیکن اس کا لہجہ تازہ ہوتا ہے

تم مجھ کو ایسے ہی اچھی لگتی ہو
پھول کے رخ پر کون سا غازہ ہوتا ہے

☆

پرانے خواب کی تعبیر بنتی جاتی ہے
یہ خامشی مری تقریر بنتی جاتی ہے

گئے زمانوں پہ بس اک نگاہ ڈالتا ہوں
نظر کے سامنے تصویر بنتی جاتی ہے

کچھ اور اس کو بڑھالیں کہ یہ شکست و ریخت
ہماری خوبیء تعمیر بنتی جاتی ہے

اب ایسا لگتا ہے جیسے تری محبت بھی
ہمارے پاؤں کی زنجیر بنتی جاتی ہے

☆

انجانے لوگوں میں دریا بانٹنے والے
پانی کی اک بوند ہمارے پیالے میں بھی

اُسکی یاد سے لاکھوں یادیں جڑی ہوئی ہیں
لاکھ حوالے ہیں اس ایک حوالے میں بھی

اُس کے ذہن پہ نقش اگر ہو جائے تو جانیں
نام تو چھپ جاتا ہے کسی رسالے میں بھی

☆

☆

ہونٹ پتھر ہیں سارے لوگوں کے
خوف اندر ہیں سارے لوگوں کے

دُھوپ چمکے تو سہم جاتے ہیں
برف کے گھر ہیں سارے لوگوں کے

کوئی قاتل نہیں ہے لیکن ہاتھ
خُون سے تر ہیں سارے لوگوں کے

لب کُشا تھے تو پھر یہ کیا ہے کہ سَر
گردنوں پر ہیں سارے لوگوں کے

اِن کی قسمت ہے تشنگی ورنہ
دل سمندر ہیں سارے لوگوں کے

یہاں خوشبو نہیں رہتی

یہی گھر تھا
کہ جس کے طاقچوں میں چاند تارے جھلملاتے تھے
وہی گھر ہے
مگر اس کے درودیوار سے اب لو نہیں آتی
یہی کمرہ تھا جس کو رنگ اپنا منبع و مرکز سمجھتے تھے
وہی کمرہ ہے جو بیتی ہوئی رنگینیوں کے نوحے لکھتا ہے
یہی دروازہ تھا
جو انگلیوں کے لمس سے مخمور رہتا تھا
وہی دروازہ ہے جو اب ترے ان خوشنما ہاتھوں
کی دستک کو ترستا ہے

یہی گھر تھا

یہی ماحول تھا خوشبو جہاں آوارہ پھرتی تھی
میں اس ماحول میں آیا تو جانا اب یہاں۔۔۔۔
خوشبو کی وہ ندی نہیں بہتی
یہاں اب تو نہیں رہتی

☆

جو شاخ شاخ کھلے تھے گلاب ٹوٹ گئے
اک ایک کر کے مرے سارے خواب ٹوٹ گئے

ہمیں بھی پوچھ کہ اس عرصہء جدائی میں
ہماری جان پہ کیا کیا عذاب ٹُوٹ گئے

کہاں سے آئے گی پھر روشنی ذرا سوچو
گر آسماں سے مہ و آفتاب ٹُوٹ گئے

کچھ ایسی اس نے سوالوں کی سنگ باری کی
مثالِ آئینہ میرے جواب ٹوٹ گئے

کسے خبر ہے کہ اک شکل کے بنانے میں
کئی ستارے کئی ماہتاب ٹوٹ گئے

☆

ایک تو پوری کہانی بھی نہیں جانتا میں
اور پھر شعلہ بیانی بھی نہیں جانتا میں

کچھ مرے پاؤں مجھے روک رہے ہیں اور کچھ
دشت کی ریت کو پانی بھی نہیں جانتا میں

ایسی دیوار کی تعمیر سے کیوں ڈرتے ہو؟
جس کی بنیاد اٹھانی بھی نہیں جانتا میں

کچھ تو یہ رنگ مرا ساتھ نہیں دے پاتے
کچھ تری شکل بنانی بھی نہیں جانتا میں

مجھ کو معلوم تو ہے دشت کی ناراضی کا
کیا کروں خاک اڑانی بھی نہیں جانتا میں

☆

یہ تو ہونا تھا ہو گیا آخر
بُجھ گیا آس کا دیا آخر

زرد پتوں کو در بدر کر کے
ان ہواؤں کو کیا ملا آخر

تو بھی چارہ گری نہ کر پایا
جس کا ڈر تھا وہی ہوا آخر

کاٹ لیں گے مگر بتاؤ تو
ہے یہ کِس جرم کی سزا آخر

☆

نظر سے دُور ہوں لیکن دکھائی دے رہا ہوں
میں چپ تو ہوں مگر اس کو سنائی دے رہا ہوں

مرے چاروں طرف نوحہ گروں کی بستیاں ہیں
میں ان کو دعوتِ نغمہ سرائی دے رہا ہوں

وہ اپنے جرم پر نادم نہیں اور مجھ کو دیکھو
میں اپنے آپ کو اُس کی صفائی دے رہا ہوں

وصال آمیز لمحوں کو بچا کر رکھنے والے
میں تجھ کو زندگی بھر کی جدائی دے رہا ہوں

☆

جو بھی منظر ہے پَس منظر ہو جائے گا
گھر ویرانہ ویرانہ گھر ہو جائے گا

اُس دن تم اک قطرے کی قیمت جانو گے
جِس دن یہ بہتا دریا تھر ہو جائے گا

جانا چاہتا ہے تو جا لیکن یہ سُن لے
مڑ کے دیکھے گا تو پتھر ہو جائے گا

مانا آج مقدر ہم سے جیت رہا ہے
لیکن کل یہ کھیل برابر ہو جائے گا

شہر کو جیسا دیکھنا چاہتے ہیں ہم ویسا
ہونے کو تو مشکل ہے پَر ہو جائے گا

☆

تابش مہر و ماہ سے پہلے
کیا تھا آب و گیاہ سے پہلے

تو مرے خواب کی پناہ میں تھا
بازوؤں کی پناہ سے پہلے

اک تباہی کا موڑ آئے گا
بچ نکلنے کی راہ سے پہلے

اور لوگوں سے رسم و راہ بھی تھی
آپ سے رسم و راہ سے پہلے

کچھ تو ایسے ہیں مر بھی جاتے ہیں
جنبشِ چشمِ شاہ سے پہلے

☆

مجھ سے تنہا یہ نظارہ نہیں دیکھا جاتا
شامِ تنہائی ستارہ نہیں دیکھا جاتا

عشق اور دوسرے کاموں میں یہی فرق تو ہے
عشق میں کوئی خسارہ نہیں دیکھا جاتا

اس قدر تنگ ہیں اس خانہ بدوشی سے کہ اب
کوچ کرنے کا اشارہ نہیں دیکھا جاتا

کیسے خاموش رہیں ، اتنی بڑی خلقت پر
چند لوگوں کا اجارہ نہیں دیکھا جاتا

اس قدر تیز ہے وہ حسن کہ اک بار اگر
دیکھ بھی لیں تو دوبارہ نہیں دیکھا جاتا

گیت

کوئی گیت لکھو
ان آنکھوں پر
ان ہونٹوں پر کوئی گیت لکھو
ان ہونٹوں کی دو مہکی مہکی کلیوں پر
ان رخساروں کے کھلتے کھلتے پھولوں پر
ان رنگوں پر کوئی گیت لکھو
ان آنکھوں کے اس بھیگے بھیگے کاجل پر
شانے پہ بکھرے گہرے کالے بادل پر
ان بالوں پر کوئی گیت لکھو
ان ساتھ گزرتے میٹھے لمحوں پر
ہمیں باندھنے والے سندر ریشمی دھاگوں پر
ان جذبوں پر کوئی گیت لکھو
ان آنکھوں پر
ان ہونٹوں پر کوئی گیت لکھو

☆

خواب یا خواب کا امکان کوئی بھی تو نہیں
آج کی شب مرا مہمان کوئی بھی تو نہیں

خامشی میں کوئی طوفان ہوا کرتا ہے
اسکی خاموشی میں طوفان کوئی بھی تو نہیں

اک ادھوری سی محبت تھی سواب وہ بھی نہیں
اب مرے سر ترا احسان کوئی بھی تو نہیں

☆

کوئی دیوار تو ہے کوئی در تو ہے مرے پاس
یہ گھر شکستہ سہی پھر بھی گھر تو ہے مرے پاس

کسے ہے فکر اگر ہمسفر نہیں کوئی
چلا چلوں گا کہ عزمِ سفر تو ہے مرے پاس

زباں سے کچھ نہ کہوں اور سمجھ میں آ جاؤں
میں بے ہنر ہوں پر اتنا ہنر تو ہے مرے پاس

یہ تنگدستی مجھے راہ کیوں نہیں دیتی
کہ بے پناہ محبت کا زر تو ہے مرے پاس

☆

علامتوں بھری زنبیل میں بھی کچھ نہیں تھا
تو پھر ترے لیے تفصیل میں بھی کچھ نہیں تھا

گلہ نہیں ہے کوئی تجھ سے ماہتاب کہ جب
مرے لیے مری قندیل میں بھی کچھ نہیں تھا

ہمارے دل کی کہانی بھی ایک دھوکہ تھی
تمہارے حسن کی تمثیل میں بھی کچھ نہیں تھا

ادھورا چھوڑ دیا جان بوجھ کر ترا خواب
میں جانتا تھا کہ تکمیل میں بھی کچھ نہیں تھا

وہ تتلی ہے

وہ تتلی ہے
گلابی اور ہلکی سبز رنگت کے پروں والی
وہ اک نازک سی تتلی ہے
وہ خوشبودار پھولوں کے تجسّس میں کبھی اڑتی
ہوئی اس سمت جاتی ہے
کبھی اس سمت آتی ہے
میں اک حیرت زدہ معصوم بچہ ہوں
وہ تتلی جب کبھی آنکھوں کے حلقے میں در آئے تو

مری آنکھیں
چمک اٹھتی ہیں
اور پوروں میں اس کا لمس جیتا جاگتا محسوس ہوتا ہے
میں اس تتلی کو چھو لینے کی دُھن میں اس۔۔۔
کے پیچھے چل نکلتا ہوں
مگر یہ سوچ کے پھر لوٹ آتا ہوں
کہ ایسی خوشنما تتلی کے پیچھے بھاگنے والا۔۔۔
کوئی جو کبھی واپس نہیں آتا

☆

خواب میں تیری شکل سمو نہیں سکتا میں
اسی لیے تو شاید سو نہیں سکتا میں

میں تو اپنے آنسوؤں سے شرمندہ ہوں
تیری آنکھ کے آنسو رو نہیں سکتا میں

حد نظر تک ریت ہی ریت ہے آنکھوں میں
اب اس ریت میں پھول تو بو نہیں سکتا میں

میں بھی تیرے جیسا ہونا چاہتا ہوں
لیکن اب دریا تو ہو نہیں سکتا میں

دل پہ تیری چپ سے لگنے والا داغ
ایسا داغ ہے جس کو دھو نہیں سکتا میں

☆

اسکی چاہت سے انکار نہیں کر سکتا
دروازے کو میں دیوار نہیں کر سکتا

یہ تو اپنی مرضی سے میں ڈوب رہا ہوں
یہ تو نہیں میں دریا پار نہیں کر سکتا

اس سے کیونکر اپنی بے تابی کا کہہ دوں
جاگے ہوؤں کو میں بیدار نہیں کر سکتا

اور کسی نے میری نیند اڑا رکھی ہے
ایسا ظلم تو میرا یار نہیں کر سکتا

رفتہ رفتہ یہ تجھ کو ہی بھولنے لگ جائے
دل کو اتنا خود مختار نہیں کر سکتا

☆

زمیں کچھ اور ہی تھی آسماں کچھ اور ہی تھا
تمہارے بعد تو سارا جہاں کچھ اور ہی تھا

وہ دوستی بھی نہیں تھی وہ دشمنی بھی نہ تھی
تمہارے اور مرے درمیاں کچھ اور ہی تھا

سبھی کے سامنے اک داستان تھی اور بس
کسے خبر کہ پسِ داستاں کچھ اور ہی تھا

لٹا تو آئے ہیں ہم رہگزارِ شوق میں دل
پر ایسی راہ میں جاں کا زیاں کچھ اور ہی تھا

ستارے ٹوٹ کے گرنے سے پیشتر اے کاش
تم آکے دیکھتے یہ آسماں کچھ اور ہی تھا

☆

یہ سب جمال اسی کا جمال ہے مرے دل
کہ میرے حسن نظر کا کمال ہے مرے دل

یہ کس لیے مجھے تم بےمثال کہتے ہو
یہ خشک پیڑ جو میری مثال ہے مرے دل

چلا گیا ہے تو جینے کے حوصلے کیسے
کہ اس کے بعد تو جینا محال ہے مرے دل

یہ کیسی روشنی راتوں میں گھلتی جاتی ہے
یہ کیسا خواب یہ کیسا خیال ہے مرے دل

ملا ہے جو بھی وہ امید سے زیادہ ہے
یہ روز ہجر ہی شامِ وصال ہے مرے دل

ہوا سے اڑتی ہوئی ریت ڈھانپ دے گی تجھے
کہ تو بھی لاشہ ہے اور پائمال ہے مرے دل

☆

یہ میں جو اک بار بات کرنے کا سوچتا ہوں
ہوا کی رہ میں چراغ دھرنے کا سوچتا ہوں

وہ گھر سے نکلے ذرا تو بے رنگیء نظر میں
یہ سارے فطرت کے رنگ بھرنے کا سوچتا ہوں

کسی کا حصہ کسی کی جھولی میں پڑ رہا ہے
یہی ہے گر زندگی تو مرنے کا سوچتا ہوں

میں آپ اپنا سہارا بنتا ہوں اکثر اوقات
میں کم ہی یاروں سے بات کرنے کا سوچتا ہوں

میں ریگزاروں میں ایک ندی کی فکر میں ہوں
میں ریگزاروں میں ایک جھرنے کا سوچتا ہوں

,,,

☆

خدا گواہ ہمیں تو خیال تک نہیں تھا
کہ تیرا حسن ترے خط و خال تک نہیں تھا

ضرورتیں تو بہت تھیں مگر کمال یہ ہے
کبھی ہماری زباں پر سوال تک نہیں تھا

ہمارے زخم سلامت ہیں کتنا اچھا ہوا
کہ تیرے پاس کوئی اندمال تک نہیں تھا

نوید بجھتے چلے جا رہے تھے میرے چراغ
مگر ہوا تھی کہ اس کو ملال تک نہیں تھا

☆

ضرورت کے لیے دامن کشا کرنے نہیں دیتی
ضروری کام بھی مجھ کو انا کرنے نہیں دیتی

عجب لڑکی ہے اپنی بات میں الجھائے رکھتی ہے
مجھے اپنا فسانہ ابتدا کرنے نہیں دیتی

چراغو! روشنی کرنے کی ہمت تم نہیں رکھتے
کوئی پوچھے تو کہتے ہو ہوا کرنے نہیں دیتی

☆

نہ جانے کون سے جذبے کی رَو میں بہہ گیا ہوں
جو بات کہنی نہیں تھی میں وہ بھی کہہ گیا ہوں

جہاں بھی دیکھی وہی شکل جلوہ گر دیکھی
میں اپنے دل کے سمندر میں تہہ بہ تہہ گیا ہوں

اب اور کوئی بھی نصرت کو آنے والا نہیں
میں اپنے دشت میں کتنا اکیلا رہ گیا ہوں

مرے خدا نے مجھے ریت سے بنایا تھا
سو کیا عجب ہے اگر گر گیا ہوں ڈھہ گیا ہوں

وہ کوئی سَیل بلا خیز تو نہیں تھا نویؔد
میں ایک آنسو کے قطرے میں کیسے بہہ گیا ہوں

☆

اس کی آنکھوں میں وہ تصویر ہی رہ جاتی مری
پانیوں پر کوئی تحریر ہی رہ جاتی مری

چند لمحوں کے لیے لوٹ کے گر آ جاتے
میرے آگے کوئی توقیر ہی رہ جاتی مری

خیر مجھ کو تو اسیری نے مٹا دینا تھا
میں نہ رہتا چلو زنجیر ہی رہ جاتی مری

دیکھتے تم کہ نکل پڑتا میں آواز کی سمت
اور خاموشی عناں گیر ہی رہ جاتی مری

تم نہ آتے تو زیادہ سے زیادہ مرے دوست
یہی ہوتا ناں کہ تعمیر ہی رہ جاتی مری

☆

☆

تمہیں بھی میرے جتنا رنج ہونا چاہیے تھا
تمہارا بھی تو تھا وہ صرف میرا خواب کب تھا

☆

تجھ کو دیکھیں تو سوچنے لگ جائیں
تو ہے اس چاند کی مثال کہ چاند

☆

اس کا شوقِ آب رسانی ختم نہ ہو جائے
ڈرتا ہوں آنکھوں سے پانی ختم نہ ہو جائے

☆

وہ پیاس تھی میرے اندر کہ میں تو مر جاتا
بچا لیا ہے ان آنکھوں کی آب جو نے مجھے

پکارتے تو سہی زندگی کے ہاتھوں ہم
مرے ہوئے تھے پر ایسے مرے ہوئے بھی نہ تھے

☆

کاش مجھ سے گلہ کرو کسی روز
اور پھر مستقل کیے جاؤ

☆

گنوادیا ہے جنہیں ایک صرف تیرے لیے
وہ سارے لوگ مری ذات کے حوالے تھے



وہ پیاس تھی مرے اندر کہ میں تو مر جاتا
بچا لیا ہے اُن آنکھوں کی آب جُو نے مجھے

فاتح پبلشرز
A-8 یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ،
اردو بازار، لاہور فون:7321118